اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً

نغمۂ سحر

غزلوں، نظموں، قطعات، رباعیات اور مراثی

کا دل آویز مجموعہ

ریاست علی ظفر بجنوری

مدرس دار العلوم دیوبند

مکتبہ رحمت، دیوبند، یوپی

"سجا رکھا ہے فرشتوں نے خیمۂ افا
حریم دہر میں ہے "نغمۂ سحر"

قیمت :

مقدمہ

از:- حضرت مولانا لقمان الحق صاحب فاروقی
شیخ الحدیث مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن، والصَّلوٰۃ والسلام علیٰ
رسولہ محمد وآلہٖ واَصحابہٖ اجمعین

امابعد!

انسان کے وہ احساسات جنھیں وہ وجدانی طور پر نہایت صاف اور شفاف شکل میں دیکھ لیتا ہے لیکن ان کی واضح لسانی تعبیر سے یکسر قاصر رہتا ہے، غالباً انہیں احساسات میں سے انسان کا احساسِ شعر بھی ہے کہ انسان شعر اور آفاقِ شعر کی تمام وسعتوں کو وجدانی طور پر پا لینے کے باوجود، اور دل و دماغ پر اس کی تمام تر لمعہ افشانیوں کے باوجود عام حالات میں اس کو بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے، غالباً شعر کا مکمل ادراکِ وجدانی کر لینے کے بعد اگر آپ اس شعر کی صحیح ترجمانی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ جواباً آپ وہی شعر پڑھ دیں۔
ارباب ذوق کا ایک معتدبہ طبقہ اس بات کا قائل ہے کہ ابہام مطلق

اور الہام شعری بشرطیکہ اس کا مورد ایک حساس قلب ہو، بسا اوقات اس درجے
متبادر اور مترادف ہوتے ہیں کہ انھیں الگ کر دینا مشکل ہوتا ہے۔ الہام مطلق
کے بارے میں ارباب نظر کی رائے یہ ہے کہ الہام ملہم الیہ کیلئے حجت
ہوتا ہے جب کہ دوسروں کے لئے اس کی نوعیت ایسی نہیں ہوتی، غالباً
اس کی وجہ یہ ہے کہ الہام کی صورت میں جو واردات قلب پر مستولی اور
پرتو فگن ہوتے ہیں ان کا وجدانی طور پر ادراک کرلنے کے بعد، ان کی تعبیر و
ترجمانی خود ملہم الیہ کی گرفت و گیرائی سے باہر ہے، اس الہام کی تعبیر اور
تفسیر ملہم الیہ صرف یہی کر سکتا ہے کہ اس الہام کو بلفظہ ادا کر دے۔

الہام اپنی طویل اقسام کے ساتھ جتنا بلند ہوتا چلا جائے گا اسی قدر
انسان اپنے طور سے اس کی تعبیر و تشریح سے یکسر درماندہ ہوتا چلا جائیگا
الہام کی آخری شکل وہ وحی ہے جس کو وحی متلو کہتے ہیں لیکن کیا اسکے
کسی جملے اور پیرایے کی تفسیر و تشریح ناطقۂ انسانی کر سکتا ہے؟
انسان بکمالِ ہمہ دانی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا کہ وحی متلو
کے زیر بحث جملے یا پیرایے کو بلفظہ پڑھ دے۔

شعر و سخن بھی ــــ اسی شرط کے ساتھ کہ اس کا مورد و مہبط ایک
حساس قلب ہو ــــ الہام کی ایک ایسی قسم ہے جو نوع انسانی کے افراد ہی
کو ملتی ہے لیکن تمام افراد کو نہیں ملتی۔ اس احساس اور الہام کی ابتدا
عام انسانی شعور ہے اور ایک گونہ مختص شکل شعر و سخن ہے، اور کوئی
بھی اچھا انسان اس حقیقت سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ ذوق انسانی

تکمیل اور تہذیب کے لئے شعر ایک ذریعہ ہے جس کی تاثیر سے کوئی ذی شعور منکر یا منحرف نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ دنیا کی اہم اقدار کی طرح شعر و سخن بھی ایک ایسی ہی قدر ہے جس کو انسان ہی نے پامال کیا ہے اور اس کی بے حرمتی کی ہے۔

ادب اردو شعر و سخن کے ایک بلند و برتر معیار پر تو شاید مدتوں پورا نہ اترے لیکن قدرت کی فیض بخشیاں کسی خطۂ زمین گویا کسی مملکتِ ادب کو قطعاً محروم نہیں رکھتیں، چنانچہ ادب اردو کی بے استعدادی بے ہمتی اور کم نگاہی کے اس دور میں بھی کبھی کبھی کوئی شخصیت اس طرح سامنے آجاتی ہے کہ جیسے قدرت نے اسے اجنبیوں کے درمیان کچھ مدت کے لئے بھیج دیا ہو، یا پھر یہ کہ یہ کوئی ایسا پھول ہے جو یکایک صحرا میں کھل گیا ہے اور اپنی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا ایک روز خود ہی شریک قافلۂ بہار ہو کر رخصت ہو جائے گا، یا پھر یہ کوئی ایک چراغ ہے جو خود بخود جل اٹھا ہے لیکن حد نظر تک اس چراغ کے سوا اور روشنی کے کوئی آثار نہیں، یا پھر یہ کوئی ایسی کشتی ہے جو ایک متلاطم اور موّاج محیط اعظم میں تنہا اندھیری رات میں بہتی چلی جا رہی ہے۔

ریاست علی ظفر بجنوری ادب اردو کی سرزمین پر ایسے ہی لالۂ صحرائی، یا شعر و سخن کے بحر متلاطم میں ایک تنہا کشتی کی طرح ہیں، انھوں نے علماء دیوبند کی طرح شعر و سخن کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر مشغلہ کے طور اختیار نہیں کیا، لیکن اس کے باوصف قطعات، رباعیات اور غزلوں اور نظموں

کا یہ دل آویز مجموعہ ادب اردو میں ایک وقیع اضافہ سمجھا جائے گا۔

ظفر بجنوری نے شعر و سخن کو اول تو بطور مشغلہ اختیار ہی نہیں کیا تھا لیکن اب چند سال سے دار العلوم دیو بند کے شعبۂ تدریس سے تعلق کے بعد شعر و سخن سے ان کا رابطہ بالکل واجبی سا رہ گیا ہے، جہاں تک راقم الحروف کو معلوم ہے کہ موصوف نے گذشتہ چار سال کے عرصہ میں صرف دو نظمیں کہی ہیں، ایک اپنے استاذ محترم حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ کا مرثیہ ہے، اور دوسرا دار العلوم دیو بند کا ترانہ یہ دونوں چیزیں اس مجموعہ میں شریک اشاعت ہیں۔

شعر و سخن سے اس درجہ بے التفاتی کے بعد "نغمۂ سحر" کی اشاعت کے لئے ان کے دیگر احباب کے ساتھ راقم الحروف نے بھی تقاضہ کیا، تاکہ کلام کا جو حصہ موجود ہے وہ ضیاع اور زمانہ کی دستبرد سے محفوظ کیا جا سکے۔ موصوف سے میرا قرابت کے سوا، ایک تعلق بچپن سے اب تک کی رفاقت کا بھی رہا ہے، اس لئے انھوں نے زور دیا کہ میں ہی "نغمۂ سحر" پر مقدمہ بھی لکھوں۔

مجھے اگرچہ شعر و سخن سے بُعد نہیں ہے لیکن ظفر بجنوری کے کلام کی گیرائی و گہرائی تک پہنچنے کے لئے جس مذاقِ سخن کی ضرورت ہے مجھے اس اعتراف میں کوئی تکلف نہیں کہ وہ میرے اندر نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر وقیع مجموعۂ کلام پر مقدمہ نویسی کا حق اردو ادب کے بقیۃ السلف میں رشید احمد صدیقی یا مولانا عبد الماجد

دریابادی کو ہے۔ یا اگر انتساب برادر محترم مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی
کے نام نہ ہوتا تو شاید مقدمہ نویسی کی زحمت اُن کو برداشت کرنا پڑتی
جنھوں نے ظفرؔ بجنوری کے مذاق شعر و سخن کو اس درجہ معیاری بنا دیا
ہے کہ وہ اپنے کلام کی روشنی میں اساطین سخن کی صف میں نظر آنے
لگے ہیں، لیکن اس کو بھی شاید اردو ادب کی کم نگاہی کہا جائے گا کہ
"نغمۂ سحر" پر مقدمہ نویسی کا فریضہ مجھے ادا کرنا پڑ رہا ہے۔

میرے نزدیک ادب اردو کی سب سے قیمتی متاع شاعری ہے اور
شاعری کی آبرو غزل ہے، اور ظفرؔ بجنوری کے مذاق شعر و سخن کی سب سے
بڑی خوبی تغزل ہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ مدحیہ اشعار بھی
کہے ہیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں، نعت میں بھی کہا ہے اور عصر حاضر کے
دیگر عنوانات کو بھی لیا ہے لیکن تغزل کا دامن جو اُن کے مذاق شعر و
سخن کی روح ہے کہیں بھی اُن کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔
غزل کو دور جدید میں بڑی وسعت حاصل ہوئی ہے، ظفرؔ بجنوری
کے واردات قلب بھی کسی ایک موضوع کے پابند نہیں، اُن کے تغزل
میں ابتذال سے پاک حسن و عشق بھی ہے، عالمانہ پختگی کے ساتھ
تصوف اور علم و حکمت کے فلسفے بھی ہیں، اخلاقی اور سیاسی مضامین
بھی ہیں، کہیں کہیں تو یہ کمال کر دیا ہے کہ بطور تغزل استعمال نہ کئے جاسکنے
والے مضمون کو جب اصولی رنگ دے کر شعر کے قالب میں ڈھالا
ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضرب المثل نے شعر کا لباس

پہن لیا ہے۔

مثلاً انھوں نے بے بنیاد پروپیگنڈے کی خدمت میں غزل کی اصطلاحات اس طرح استعمال کی ہیں ؎

شہادتِ گل و بلبل بہت ضروری ہے
کوئی ہزار پکارا کرے بہار آئی

عصرِ حاضر کے انحطاط پر انتباہ دیتے ہوئے کہا ہے ؎

خبر کرو دلِ بلبل کے زخمِ پنہاں کو
بہار چھوڑ چکی سعیِ چارہ فرمائی

بڑوں کے دامن سے وابستگی ہر کسی کے لئے قابلِ فخر ہوتی ہے لیکن چھوٹوں کے ساتھ شفقت و رافت کے امتحان میں پورا اترنا ہر کسی کیلئے آسان نہیں ہے، یہ مضمون تمثیلی رنگ میں ظفر کے کلام میں اس طرح اصولی طور پر بیان ہوا ہے ؎

اے چرخ تیرے واسطے سب مہر بن گئے
پھولوں کے واسطے کوئی شبنم نہیں ہوا

کمزوریوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کی مذموم سعی کو انھوں نے اپنے تغزل کا اصولی جامہ اس طرح پہنایا ؎

دستور ہے جب فصلِ خزاں دشمنِ گل ہو
اطرافِ گلستاں پہ لگا دیتے ہیں قدغن

مجھے دورانِ مطالعہ ان کے کلام میں وہ مضامین بھی ملے جو متقدمین کے یہاں بڑے سلیقے اور بڑی خوبی سے استعمال ہوئے ہیں اور متاخرین نے غالباً ان کو اس لئے نہیں لیا ہے کہ وہ اِن مضامین کو متقدمین سے بہتر یا اُن کی طرح استعمال کرنے پر قادر نہیں تھے، اس کی مثال میں، میں مرحوم غالب کا یہ مشہور شعر پیش کروں گا ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس مضمون نے جب ظفرؔ بجنوری کے حسنِ ادا کا سہارا لیا تو تعبیر کی خوبی ملاحظہ ہو ؎

نادم ہوں واقعی کرم بے حساب سے
خوش آمدید! آپ کہاں میرا گھر کہاں

غالب مرحوم کی جلالتِ شان کے احترام میں مجھے تقابلی تجزیہ نہیں کرنا ہے، لیکن اس مضمون کی ادائیگی کے لئے نزاکتِ خیال استعجاب اور روزمرہ کا استعمال، اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے جو ظفرؔ کے کلام میں ہے۔

یا مثلاً مومنؔ مرحوم کا شعر ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ظفر بجنوری نے کہا ہے

تب کھلا آپ ہیں شریکِ سفر
میرے ہمراہ کوئی جب نہ ہوا

استاد مومنؔ کا شعر اپنی جگہ بہت بھاری ہے، تمام اساتذۂ سخن نے اس کی تعریف کی ہے، لیکن قابلِ غور یہ بات ہے کہ مومنؔ مرحوم کے بعد شعرا اردو نے اس مضمون کو ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا، ظفر بجنوری کی جرأت رندانہ ملاحظہ ہو کہ انھوں نے یہ مضمون بڑے سلیقہ سے بیان کر دیا اور ان کا شعر بھی استادانہ فن کاری کی دلیل ہے۔

عصر جدید کے غزل گو شعرا میں اصغرؔ گونڈوی مرحوم کو مضمون آفرینی اور سلیقۂ بیان کی رُو سے ایک ممتاز مقام حاصل ہے — "نغمۂ سحر" میں کئی غزلیں، اصغرؔ مرحوم کے تتبع میں کہی گئی ہیں، اور لطف سے خالی نہ ہوگا اگر میں ان غزلوں کی ابتدا کا سبب بھی بیان کر دوں۔

یہ غالباً سنہ ۱۳۸۰ھ کا ذکر ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا سید فخرالدین احمد صاحب قدس سرہٗ کی مجلس میں اصغرؔ مرحوم کا یہ شعر پڑھا گیا

سُنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی!
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

شعر سن کر پہلے تو حضرت نے قدرے تحسین کی اور پھر یہ نقد فرمایا کہ نزاکتِ مضمون کے باوصف کمی یہ ہے کہ جناب باری میں "بیتابی" کی نسبت ہو گئی، اور بیتابی ایک صفتِ اضطراری ہے اور اضطرار سے باری تعالیٰ پاک اور منزہ ہے۔[1]

---

[1] بالغ نظر علماء امت کے یہاں نثر کے ساتھ نظم میں بھی شریعت کی مقرر کردہ حدود کی پابندی اور عقیدے کی سلامتی ضروری رہی ہے ماضی میں بھی ایسا ہو چکا ہے کہ جب خلیفۂ وقت کی بارگاہ میں شاعر نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہا گیا یہ شعر پڑھا ؎

وکان مبدء ھذا الدین من رجل
سعیٰ فاصبح یدعی سید الرسل

(اس دین کی ابتدا ایک ایسے شخص سے ہوئی جس نے کوشش کی اور اس کو سید الرسل کا خطاب دیا گیا) تو علماء نے اس شعر کی تغلیط کی کہ اس میں لفظ سعیٰ نبوت کے کسبی ہونے پر دلالت کر رہا ہے، جب کہ اہل سنت کے عقیدے کے مطابق نبوت ایک وہبی چیز ہے۔

اللّٰہ یعلم حیث یجعل رسالتہ
(اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کے لئے کس کو منتخب فرمائے۔)

حضرت رحؒ کے اس تبصرے کو سُن کر ظفرؔ بجنوری نے یہ شعر موزوں کیا؎

کرم کے ساتھ لامحدود رکھیں لغزشیں ہم نے

بقدرِ ظرف کیا رکھتے متاعِ ذوقِ عصیاں کو[۱]

شعرائے کرام غور فرمائیں کہ عقیدے کی سلامتی کے ساتھ بیان کیا گیا یہ مضمون لطافت و بلاغت میں پہلے شعر سے سوا ہے۔

اس کے بعد ظفرؔ بجنوری نے پہلے تو اصغرؔ مرحوم کے قوافی کی پابندی کے ساتھ پوری غزل کہی، اور اس کے علاوہ بھی کئی غزلیں اس طرح کہیں جس میں کہیں جگہ وہ اصغرؔ کو نہ پاسکے، کہیں جگہ ان کے برابر آ گئے اور کہیں جگہ اصغرؔ سے آگے نکل گئے۔ ملاحظہ ہو۔ اصغرؔ مرحوم نے کہا تھا؎

قفس ہو، دام ہو، کوئی چھڑائے اب یہ ناممکن

ازل کے دن کلیجے میں بٹھایا تھا گلستاں کو

اوّل تو یہ کہ بقول مولانا عبدالسلام ندوی "کلیجے میں بٹھانا" محاورہ نہیں ہے، دوسرے یہ کہ مصرعِ اوّل کی بندش بھی چست نہیں ہے۔

---

[۱] علمائے دیوبند کے میر کارواں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے؎

یہ سن کے آپ شفیعِ گناہگاراں ہیں

کئے ہیں میں نے اکھٹے گناہ کے انبار

ظفر بجنوری نے یہ مضمون اس طرح ادا کیا ہے

بہاریں، پا شکستہ، میں اسیر بے پر و بالی
قفس میں کون لے آیا، خداوندا گلستاں کو

اصغر مرحوم کی ایک دوسری غزل کا شعر ہے

برگِ گل کے دامن پر رنگ بن کے جمتا کیا
اس فضائے گلشن میں، موجۂ صبا ہوتا

ظفر بجنوری نے کہا ہے

بُو، اسیرِ حلقہ ہے، رنگ رہنِ دامن ہے
جستجو مبارک ہو، موجۂ صبا ہوتا

اصغر کے شعر میں صرف رنگ کا تذکرہ تھا اور "موجۂ صبا" ہونے کی تلقین پر کوئی استدلال نہیں تھا، ظفر کے شعر میں رنگ کے ساتھ بُو کا بھی تذکرہ ہے اور اختصار کے باوجود دونوں میں پائی جانے والی کمی کا بھی اظہار ہے اور موجۂ صبا بن جانے کی تلقین کے لئے "جستجو مبارک ہو" سے استدلال بھی موجود ہے۔

اصغر مرحوم کی ایک تیسری غزل میں "معبود" کا قافیہ دو جگہ اس طرح استعمال ہوا ہے

جو لے اڑا مجھے مستانہ وار ذوقِ سجود
بتوں کی صف سے اٹھا نعرۂ "انا المعبود"

نیازِ سجدہ کو شائستہ و مکمل کر
جہاں نے یوں تو بنائے ہزار ہا معبود

ظفر کے کلام میں پہلے شعر نے اسلامی قالب، اور دوسرے شعر نے اصولی رنگ اس طرح اختیار کیا ہے ؎

اڑا ہے لے کے مجھے صرف میرا ذوقِ سجود
کوئی ہزار پکارا کرے انا المعبود

جنوں کے ہاتھ ہے اب آبروِ عبادت کی
بنادئے ہیں خرد نے ہزار ہا معبود

یہ تمام غزلیں "نذرِ اصغر" کے عنوان سے "نغمۂ سحر" میں شامل ہیں اور اہلِ نظر کے لئے خاصہ کی چیز ہیں۔

ظفر کے کلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ مضامین کے تنوّع کے ساتھ، پیرایۂ بیان میں بھی تنوّع پر پوری طرح قادر ہیں، وہ ہر رنگ میں کہتے ہیں اور کسی رنگ میں بھی فصاحت و بلاغت، شکوہِ بیان اور شاعرانہ بلند آہنگی میں کمی کو راہ نہیں ملتی، انھوں نے میر کے رنگ میں بھی کہا ہے غالب کی زمین میں بھی لکھا ہے، کہیں کہیں اقبال مرحوم کا اسلوب بیان بھی ہے، حسرت مرحوم کے رنگِ تغزل سے بھی "نغمۂ سحر" خالی نہیں ہے میں اس کے لئے چند مثالیں پیش کروں گا۔

میر کی زبان میں چند شعر سنیئے۔

رُت بدلے گی، پھول کھلیں گے، جام مجھے چھلکانے دو
جام مجھے چھلکانے دو، کونین کو وجد آجانے دو

تم بن اپنی رین اندھیری، دور تلک سناٹا ہے
ایک مرا یہ دل ہے پیاسا، اور مرے پیمانے[۱] دو

ذرّہ ذرّہ سینہ کھولے ا تیری طرف کیوں لپکے ہے
ہم بیچاروں کی بھی سن لو، ہم کو وہاں تک آنے دو

میرؔ مرحوم کی زبان کے لئے اس زمین کے انتخاب کی وجہ غالباً میرؔ مرحوم کا یہ شعر ہو گا۔

بات بنانا مشکل سا ہے، شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکرِ بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

بعض اشعار میں خالص اقبال کا رنگ جھلکنے لگا ہے۔ جیسے

کسے نسبت ہے چشم معتبر سے
حذر اے دل جہان کم نظر سے
منوّر ہے حریم زندگانی
گداز شام سے آہ سحر سے

اور اقبالؔ مرحوم کا یہ رنگ ان کی نظم "بمسافر شوق" میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔

---

[۱] مراد ہیں آنکھیں ۱۲

حسرت کے رنگ میں بھی سہل ممتنع غزل سنیئے۔

زندگی مہبطِ الہام نظر آتی ہے
تیرے نادیدہ اشارات کو سمجھاتی ہے

ہائے وہ شوقِ ملاقات کا عالم اے دوست
جب مری روح ترے نام کو دہراتی ہے

آتے آتے وہ کہیں بر سرِ بام آتے ہیں
آرزو تابسحر سجدے کئے جاتی ہے

عمر بھر تیرے نظاروں ہی سے فرصت نہ ملی
کس کو تسلیم کہ دنیا بھی نظر آتی ہے

آؤ اے ہم نفسو شغلِ مے و جام کریں
آرزو بادۂ گلگوں سے نکھر جاتی ہے

اس درجہ قدرتِ کلام اور تغزل سے طبعی مناسبت کے سبب ظفر کی پیش کردہ تمام اصنافِ سخن میں رنگِ تغزل ہی نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے استاد محترم حضرت مولانا محمد عثمان صاحب کاشف الہاشمی کی شادی کے موقعہ پر ایک نظم کہی ہے، کہا جاسکتا ہے کہ اس میں بہاریت کم ہے لیکن یہ شعراء کرام ہی بتاسکیں گے کہ ایسے مواقع پر رنگِ تغزل کو برقرار رکھنا کتنے قادر الکلام ہونے کی غمازی کرتا ہے، چند شعر آپ بھی سنیئے۔

ہر ذرّہ یوں ہے مست کہ رقصاں کہیں جسے
ہر موج یوں رواں کہ غزلخواں کہیں جسے
وہ موج رنگ و نورِ گلستاں کہیں جسے
وہ روئے تابناک کہ قرآں کہیں جسے
اس طرح اتصال سے ہیں خندہ ہائے گل
طوفاں بدوش موجِ بہاراں کہیں جسے
موجِ نشاطِ بادہ سے خم ہو گیا ہے خم
وہ کفر ہے کہ غیرتِ ایماں کہیں جسے

یا مثلاً نعت شریف نے عصرِ حاضر میں جو رنگ اختیار کر لیا ہے وہ جذبات و عقیدت کے اظہار کے بطور تو مستحسن ہے لیکن نعت کے دائرے میں رنگِ تغزل کی نمود ظفر بجنوری کے یہاں کیا خوب ہے۔

فنا ہوا تو ملی منزلِ سلام مجھے
کمالِ بادہ کشی ہے شکستِ جام مجھے
خدا بہ نطقِ بشر محوِ گفتگو یعنی
کمالِ نطقِ بشر ہے ترا کلام مجھے
ہر اک بہار نے آ کر مری شہادت دی
چمن چمن سے ملا ہے ترا پیام مجھے

یا مثلاً حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کا پورا مرثیہ اور

اور بطور خاص اس کا آخری بند مرثیہ کی سطح پر رنگِ تغزل کا شاہکار ہے
غزل کی اصطلاحات میں، غزل میں استعمال نہ کیے جانے والے مضامین کی
کامیاب ترجمانی کا یہ انداز عصرِ حاضر کے شعراء کرام کیلئے ایک دعوتِ فکر ہے۔ اگر
اس اندازِ بیان کو اپنایا جا سکے تو یہ اردو غزل کی نشاۃِ ثانیہ اور تادیر اس کی
آبرو کے تحفظ کا ذریعہ بھی بن سکے گا۔

قدرتِ کلام کی ایک دلیل جو مجھے اُن کے کلام میں نظر آئی یہ ہے کہ وہ دو
متضاد مضامین کو بھی اس سلیقے سے استعمال کرتے ہیں کہ ہر مضموں کی کرشمہ کاری
دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔
مثلاً پروانے کی فداکاری کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

تمام رات پشیماں رہی تجلی سے
نثارِ شمع ہوا اس طرح سے پروانہ

جبکہ دوسری غزل میں انھوں نے یہ کردار شمع کی طرف منسوب
کر دیا ہے ؎

تاب و تبِ پیہم کی پتنگے کو خبر کیا
خود شمع کے جلووں نے بنایا ہے یہ کردار

کون کہہ سکتا ہے کہ دونوں اشعار میں سے کوئی بھی شعر تغزل
کا شاہکار نہیں ہے۔

اسی طرح انھوں نے دارالعلوم کا ترانہ لکھا، اس میں دارالعلوم کی خصوصیات بھی ہیں، اکابر دارالعلوم کا ان کے امتیازی رنگ کے ساتھ تذکرہ بھی ہے، تاریخی واقعات کی طرف اشارے بھی ہیں لیکن ان تمام مضامین کے بیان میں شعری اصطلاحات اور تغزل کے تحفظ کا جو ثبوت ظفر بجنوری نے پیش کیا ہے وہ ان کی انفرادیت کی واضح علامت ہے۔

مثلاً مبشرات دارالعلوم میں یہ ہے کہ خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خود رہے کی تعمیر کی جگہ نشانات لگائے جو صبح کو دیکھے بھی گئے یہ واقعہ جب شعر و سخن کی اصطلاح میں بیان ہوا تو تغزل کی منہ بولتی تصویر بن گیا ہے

خود ساقیٔ کوثر نے رکھی میخانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے دیوانوں کی روداد یہاں

یا مثلاً علامہ انور شاہ کشمیری، اور حضرت مولانا فخر الدین صاحب کے تذکرے میں ان دونوں بزرگوں کی ہمہ جہت شخصیت کا تذکرہ بایں اسلوب ہوا ہے جس میں ایک کا دوسرے سے استفادہ بھی واضح ہو رہا ہے

رومی کی غزل، رازی کی نظر، غزالی کی تلقین یہاں
روشن ہے جمالِ انور سے، پیمانۂ فخر الدین یہاں

ترانے کی خصوصیات اور اس کے تمام پسندیدہ اشعار بخوفِ طوالت

نقل نہیں کیے جا رہے ہیں، لیکن اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ کم سواد مجھے قاسمی عصبیت کا شکار قرار دیں گے تو میں بجا طور پر یہ کہتا کہ کسی بھی مادرِ علمی کو، اس کے کسی فرزند نے اتنا شاندار، اتنا اثر انگیز، اتنا فصیح و بلیغ اور اتنا جامع خراجِ عقیدت پیش نہیں کیا ہے جتنا ظفرؔ بجنوری نے دارالعلوم دیوبند کو پیش کیا ہے۔

بے محل نہ ہوگا اگر مقدمہ کے آخر میں ظفرؔ بجنوری اور ان کے خاندان کے بارے میں بھی کچھ تحریر کر دیا جائے۔

ظفرؔ بجنوری ۹ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو شہر علی گڑھ کے محلہ حکیم سرائے میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد بزرگوار جناب منشی فراست علی صاحب مرحوم بسلسلۂ درس و تدریس مقیم تھے آبائی وطن موضع حبیب والا، ضلع بجنور ہے، جہاں عہد اکبری سے شیوخ انصار آباد ہیں۔

شجرۂ نسب یہ ہے:

ریاست علی ابن فراست علی بن مشرف علی بن صادق علی بن اصغر علی بن کمال علی بن مولوی احسان علی بن مولوی محمد امین بن محمد وارث بن عبدالحیٔ بن شیخ سعد اللہ بن شیخ عبدالحمید بن شیخ حبیب اللہ بن شیخ خان بن برخوردار بن عبدالکریم بن عبدالخالق بن عبدالرؤف بن شیخ اسعد

بن ابو طاہر بن عبد الملک بن شیخ صادق بن غازی
سعد اللہ بن خواجہ جلال الدین بن خواجہ سلیم بن خواجہ
اسمٰعیل بن شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبد اللہؒ بن خواجہ
ابی منصور بن ابی معاذ بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن
منصور مست بن سیدنا ابو ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ

حضرت ابو ایوب انصاری صحابہ کرام کے درمیان، میزبانِ
رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے ممتاز ہیں، ان کے صاحبزادے
حضرت ابو منصور تابعی، عہد عثمانی میں سلسلۂ جہاد خراسان تشریف
لائے اور ہرات میں مقیم ہو گئے۔ حضرت ابو منصور کی آٹھویں پشت
میں شیخ الاسلام حضرت عبد اللہ انصاری ہروی ۳۹۶ھ میں ہرات
ہی میں پیدا ہوئے۔ حضرت شیخ الاسلام زہد و تقویٰ اور علم و فضل
میں اپنی نظیر آپ تھے، اور پچاسی سال کی عمر میں ۴۸۱ھ میں ہرات
میں وفات ہوئی، ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔

شیخ الاسلام حضرت عبد اللہ انصاری کے کئی صاحبزادے
تھے، جن میں سے ایک کی اولاد میں گنگوہ ضلع سہارنپور کے انصار
ہیں، اور دوسرے کی اولاد سے انبہٹہ کے انصار ہیں اور تیسرے صاحبزادے
خواجہ اسمٰعیل کی اولاد سے علمائے فرنگی محل اور انصاریان حبیب والا
ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت عبد اللہ کی چوتھی پشت میں خواجہ جلال الدین
نے سلسلۂ جہاد ہندوستان کا سفر کیا اور دہلی کے قریب قصبہ سرسل

میں قیام پذیر ہوئے، خواجہ جلال الدین کے صاحبزادوں میں خواجہ حامد کی اولاد سے تو علماء فرنگی محل نے نام پیدا کیا، جن کے جدّ امجد قطب شہید سہالوی متوفی ۱۱۰۳ھ ہیں، اور خواجہ جلال الدین کے دوسرے صاحبزادے، غازی سعد اللہ کی اولاد سے انصار حبیب والا ہیں۔

انصار حبیب والا کے جدِّ امجد غازی سعد اللہ کی دسویں پشت میں حضرت شیخ حبیب اللہ متوفی ۱۰۲۴ھ ہیں جو عہد اکبری میں قصبہ نیم کھار مسرک ضلع سیتاپور سے شاہی منصب ترک کرکے، اپنے شیخ بندگی حسین کی خدمت میں چاندپور ضلع بجنور تشریف لائے شہنشاہ جلال الدین اکبر نے شیخ حبیب اللہ صاحب کے لئے تین موضع معاف کئے جن میں سے ایک موضع نیض پور متصل نہٹور ہے، جو شیخ صاحب نے اپنے ایک ملازم نیض محمد صاحب کو دے دیا تھا۔ دوسرا موضع حبیب والا ہے، جس کے حروف تہجی سے اس آبادی کی تاریخ اساس ۹۸۰ھ نکلتی ہے، یہاں شیخ کی اولاد آباد ہوئی، اور تیسرا موضع سرائے شیخ حبیب متصل چاندپور ہے، جہاں خود شیخ صاحب نے قیام کیا اور وہیں ۱۰۲۴ھ میں انھوں نے انتقال کیا، تاریخ وفات یہ ہے

قل رحل الشیخ محبوب القلوب ؏ هو حبیب الله محی السنة
وکان تاریخ الوصال لنرهبه ؏ هو حبیب والبشرو ابا الجنة

۲۴ ھ ۱۰

اور اسی موضع سرائے شیخ حبیب میں شیخ سے تین سال قبل ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا، جن کی تاریخ وصال یہ ہے۔

از دارِ فنا نمود رحلت — چوں دید رسوم بے وفائیش
بُد عصمتِ او جمالِ خاتون — تا چند نویسم از ثنائیش
تاریخ طلب چوں کردم از غیب — دادند ندا بہشت جائیش

۱۲۱۰ھ

قصبہ حبیب والا قدیم ہی سے ایک مردم خیز بستی ہے، اور چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے لیئے علم کی دعا کی ہے اس لیئے ان کی اولاد میں علمی خصوصیات ہمیشہ پائی جاتی رہی ہیں[1]۔

---

[1] حبیب والا ایک ایسا قصبہ ہے جسکی آبادی اس وقت ایک ہزار نفوس سے متجاوز نہیں ہے لیکن دارالعلوم کی صدسالہ تاریخ میں یہ فخر شاید اسی آبادی کو حاصل ہے کہ اس قصبہ کے فرزندوں نے تین بار دارالعلوم کے دورۂ حدیث میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے، ایک مولانا ضیاء الدین صاحب حبیب والوی ثم علی گڑھی، دوسرے حضرت مولانا افتخار الحق صاحب بجنوری وارد حال آزاد نگر رڑکی، اور تیسرے نغمۂ سحر کے مصنف ریاست علی ظفر بجنوری یہی وجہ ہے کہ حبیب والا کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے اہل نظر نے حبیب والا کو بجنور کا خطۂ یونان کہا ہے۔ بانی مسلم یونیورسٹی سر سید احمد خاں نے بھی اپنی تصانیف میں اہل حبیب والا کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے۔

قصبہ حبیب والا میں بھی علماء، فضلاء، اولیاء، ادیب اور شعراء کی کسی دور میں بھی کمی نہیں رہی ہے، لیکن یہ لوگ ہمیشہ گوشہ گیر اور نام و نمود سے بے نیازی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے اس لئے ان کے کارناموں سے دنیا واقف نہ ہو سکی۔

ظفر بجنوری اسی خانوادۂ علمی کے چشم و چراغ ہیں سنہ ۴۲ء میں ان کے والد جناب منشی فراست علی صاحب علی گڑھ میں، اپنے دو صغیر السن بچوں وراثت علی اور ریاست علی کو چھوڑ کر وفات پا گئے، بڑے لڑکے وراثت علی نے علوم عصریہ کو اختیار کیا، اور وہ سولہ سال کی عمر میں ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر کے سنہ ۵۴ء میں انتقال کر گئے، اور چھوٹے لڑکے ریاست علی نے سنہ ۵۱ء میں پرائمری اسکول حبیب والا سے درجۂ چہارم کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد ان کے پھوپا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب ناظم کتب خانہ دار العلوم دیوبند، علم دین پڑھانے کی غرض سے ان کو دیوبند لے آئے۔

ریاست علی نے مولانا سلطان الحق صاحب کی زیر تربیت پہلے فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی، اور اس کے بعد دار العلوم دیوبند ہی میں علوم عربیہ کی تکمیل کی، خاندانی شوقِ علم اور ذکاوتِ طبع کے سبب وہ ہمیشہ اپنی جماعت میں ممتاز رہے اور ۱۹۵۷ء میں انھوں نے دورۂ حدیث کے امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ دار العلوم سے فراغت کے بعد وہ اپنے استاذ محترم حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کے دامن سے وابستہ ہو گئے، اور انھوں نے مسلسل تیرہ سال تک حضرۃ الاستاذ کی علمی مجلسوں سے استفادہ کیا۔

اسی دوران انھوں نے ادیب کامل علی گڑھ کا امتحان دیا اور اس میں بھی فرسٹ پوزیشن حاصل کر کے سر سید میڈل حاصل کیا اور حضرۃ الاستاذ کے درسی افادات کو مرتب کر کے "ایضاح البخاری" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا، اس سلسلے کے تیرہ حصے طبع بھی ہو چکے ہیں ۱۹۶۲ء میں حضرت مولانا سلطان الحق صاحب کی صاحبزادی صفیہ شاہاز سے عقد نکاح ہوا، اور اس وقت تین ہونہار لڑکے محمد سفیان عمر ۱۰ سال، محمد عدنان عمر ۶ سال، محمد سعدان عمر ایک سال بحمد اللہ موجود ہیں۔

درمیان میں بسلسلۂ ملازمت دو تین سال وہ دہلی مقیم رہے، جہاں ایک بار الجمعیۃ پریس، اور دوسری بار الجمعیۃ بکڈپو کے منیجر کی حیثیت سے انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کی خدمات انجام دیں۔

اور اب ۱۹۷۱ء سے وہ عالم اسلام کی ممتاز دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں مدرس عربی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اگرچہ شعر و سخن ظفر بجنوری یا کسی بھی عالم کے لئے کچھ زیادہ قابلِ افتخار وصف نہیں ہے، لیکن اگر اپنے لئے نہیں تو اردو ادب کی آبرو کے تحفظ کے لئے اُن جیسے قادر الکلام حضرات کو مشق جاری رکھنی چاہیئے۔

اس لئے "نغمۂ سحر" اپنی گوناگوں خوبیوں اور خصوصیات کی بنا پر عصر حاضر کے ادب میں وقیع ترین اضافہ ہے، مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کو "نغمۂ سحر" پر مقدمہ لکھنے کا اتفاق ہوتا تو وہ شاید "نغمۂ سحر" کی وساطت سے ظفرؔ بجنوری کے تعارف پر حالیؔ کا یہ شعر پڑھنے پر مجبور ہوتے ؎

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

مجھے امید ہے کہ اہل نظر "نغمۂ سحر" کی قدر کریں گے اور اس کو اردو ادب کے لئے ۱۹۷۵ء کا سب سے قیمتی، سب سے وقیع اور سب سے حسین تحفہ تصور فرمائیں گے۔

لقمان الحق فاروقی
مدرسہ امداد الاسلام، صدر بازار میرٹھ، یوپی
۱۰ نومبر ۱۹۷۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ربنا تقبل منا

انک انت السمیع العلیم

شریک سوز و ساز آرزو ہو

کسی صورت شہید جستجو ہو

خداوندا! مرا مقصد یہی ہے

کہ اس دنیا کا نصب العین "تو" ہو

ریاست علی ظفر بجنوری

کان اللہ لہ و کان معہ اللہ

بحضور رحمۃ للعالمین

صلی اللہ علیہ وسلم

خزف چینِ لبِ ساحل رہیں گے
اسیرِ سعیِ لاحاصل رہیں گے

ترے میکش بغیرِ چشمِ الطاف
رہیں گے صرفِ آب و گل رہیں گے

ریاست علی ظفر بجنوری

نعت

بحضورِ سرورِ کائنات فداہ روحی وروح ابی وامی

صلے اللہ علیہ وسلم

فنا ہوا تو ملی منزلِ سلام مجھے
کمالِ بادہ کشی ہے شکستِ جام مجھے

عنایتوں کا یہ عالم کہ زندگی ہمہ کیف
اب اور جو بھی ملے رحمتِ تمام مجھے

نمودِ صبحِ سعادت، نجوم در آغوش
ملا ہے تیری رسالت سے یہ پیام مجھے

چلا ہوں سوئے حرم اور کہکشاں بردوش
فریبِ زیست نے رکھا تھا زیرِ دام مجھے

خدا بہ نطقِ بشر محوِ گفتگو یعنی
کمالِ نطقِ بشر ہے ترا کلام مجھے

خوشا یہ شرفِ گرامی کہ کافرانِ عجم
سمجھ رہے ہیں ترے در کا ننگ و نام مجھے

بحدِ نعتِ گرامی یہی کہے گا بشر
ملا ہے آپ کے در سے مرا مقام مجھے

زمانہ آنکھ سے دیکھے گا محشرِ جذبات
کبھی حضور نے بخشا جو اذنِ عام مجھے

ہر اک بہار نے آ کر تری شہادت دی
چمن چمن سے ملا ہے ترا پیام مجھے

بہار، مدحِ مسلسل ہے تا بعرشِ بریں
خدا کے بعد ملا ہے ترا ہی نام مجھے

ظفرؔ نہ پوچھ، قیامت ہے وہ نظر جس نے
سکھا دیا ہے تمنا کا احترام مجھے

بمسافرِ شوق

عازمِ بیت اللہ کے نام

ہوا ہے شوق سرگرمِ مذاقِ آبلہ پائی
دلِ بیتاب سے رخصت ہوئی تابِ شکیبائی

جمالِ روئے عالمتابِ منزل کارفرما ہے
مگر در پردۂ دیوانگی ہے کارفرمائی

مرتب جنبشِ چشمِ کرم سے جذبِ محکم ہے
بہانہ لطف کا ہے کاروبارِ جادہ پیمائی

جنوں کے بازوؤں میں قوتِ پرواز پیدا ہے
زبانِ شوق تک آنے لگی آہنگِ یکتائی

تفکر لطف آموزِ تعین ہوتا جاتا ہے
کہ چشمِ آرزو تک آ گئے انوارِ لیلائی

تڑپ کر موج اک آغوشِ ساحل سے نکل آئی
کہ اب تک آنکھ سے مستور تھی دریا کی پہنائی

خرد لیکر چلا ہے آج نذرِ چاک دامانی
زہے لطفِ کریمانہ زہے اندازِ شیدائی

انہیں دو حرف میں پنہاں ہے تعبیرِ جہانگیری
نظر کا اکتسابِ نور اور دل کی جبیں سائی

جنونِ گردشِ پیہم دلیل کامرانی ہے
جنوں کی آخری منزل مقامِ جانفشانی ہے

مبارک اے مسافر شیوۂ اہلِ رضا تجھکو
مبارک اضطرابِ طائرِ قبلہ نما تجھکو

مبارک ہو جبیں کو انتسابِ عتبۂ عالی
مبارک ہو کرم کی ابتدا بے انتہا تجھکو

مبارک ہو شکستِ حلقۂ زنجیرِ امکانی
مبارک ہو چمن زارِ تجلّی کی ہوا تجھکو

قدم راہِ محبت پر، نظر حسنِ عنایت پر
مبارک ہو کرم کا اک مرتّب سلسلہ تجھکو

خوشا وہ تشنہ کامی جس پہ ساقی کو پیار آئے
مبارک میگسارِ عشق، تحریکِ عطا تجھکو

مبارک ہو شریکِ زمرۂ اہلِ وفا ہوتا
مبارک ہو جنوں کی آخری منزل عطا ہوتا

کھلے گا اے مسافر تجھ پہ اصلِ سرخوشی کیا ہے
قیامِ زندگی کیا ہے، مقامِ بندگی کیا ہے

یہ طوفان و تلاطم صورتِ تادیب ہستی ہے
گھر پہچانتا ہے صورتِ تابندگی کیا ہے

بنامِ حجِّ بیت اللہ تکمیلِ جنوں ہو گی
کرم کھولے گا تجھ پر سوز و سازِ سرمدی کیا ہے

وقوفِ بارگاہِ حق شبابِ زندگانی ہے
کسی کو کیا خبر ہے لذّتِ دیوانگی کیا ہے

دلِ پروانہ فطرت اور شمعِ جلوہ گستر ہو
کوئی اسوقت دیکھے صورتِ پروانگی کیا ہے

تمنا بھی اسی کی ہو، وہی ہو جادہ و منزل
مسافر تو نے سمجھا ہے عروجِ زندگی کیا ہے

زمیں والوں کا ملجا، مہبطِ انوارِ رحمت ہے
تجھے جس کی تمنا ہے، تجھے جس سے عقیدت ہے

مسافر بارگاہِ آیتِ رحمت میں کہہ دینا
کہ اپنی زندگی منجملہ خوابِ پریشاں ہے

وہ جس کو تو نے بخشا تھا مقامِ نازآرائی
وہ مردِ حق نما گویا چراغِ زیرِ داماں ہے

طلب آلودۂ امکاں، توکل خاک آلودہ
دلِ بدبخت اپنی بے یقینی پر پشیماں ہے

کوئی بھی میکدہ ہو تشنہ سامانی نہیں جاتی
کہ صدہا سال سے برپا وہ تفریقِ دل و جاں ہے

مسافر عرض کردینا کہ آخر ہم کہاں جائیں
ہمارا بابِ زنداں ہے نہ ایوانِ گلستاں ہے

مسافر ان سے کہنا کس کو جاکر زخم دکھلائیں
یہاں پر تیراندازی مداوائے دل و جاں ہے

سیہ کاروں کی جانب قصدِ رحمت کی ضرورت ہے
کہ اس امت کو پھر چشمِ عنایت کی ضرورت ہے

مسافر عرض کرتا، روضۂ اطہر کی جالی پر

خدارا برقِ آسودہ کو جہدِ رم عطا کیجیے

ادب سے پوچھنا ان سے کہ آخر کیا کہوں جا کر
کہا تھا مینواؤں نے کہ ہم کو بھی بلا لیجیے

مسافر اُن کو ساری سرگذشتِ غم سنا دینا
اگر کچھ اور پوچھیں چیر کر سینہ دکھا دینا

غزلیں

(۱)

در پیش مجھے مرحلۂ لطف و کرم ہے
پیشانیٔ اربابِ خرد، دیر سے خم ہے

شاید کوئی دیوانہ سرافرازِ کرم ہے
اک شورِ "انا الحق" پسِ دیوارِ حرم ہے

ہے عصمتِ گوہر کے لئے شورشِ طوفاں
اے دیدۂ بینا، یہی تعبیرِ ستم ہے؟

دم در کشش و بیتاب ہوں ہر آن کہ بخشا
وہ دردِ محبت کہ زیادہ ہے نہ کم ہے

اے روحِ سبو خانہ، خبر ہے کہ نہیں ہے
ہنگامہ ابھی در پسِ دیوارِ حرم ہے
افسوس کہ ہے تشنۂ تعبیر ابھی تک
وہ دیدۂ عبرت کہ بہت دیر سے نم ہے
"خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ"
معلوم ہوا اپنی حقیقت بھی عدم ہے

کس سمت نکل آئے ظفر جوشِ طلب میں
احساسِ اَلَم ہے نہ ہمیں شکوۂ غم ہے

---

(۲)

جب تک جنوں شریکِ دو عالم نہیں ہوا
ساقی ترے حضور کوئی خم نہیں ہوا

کتنا بلند ہے یہ مقامِ شکست بھی
غم اس طرح ہوا کہ کوئی غم نہیں ہوا

گو ہم سے پھیر لی ہے ہر اک جام نے نظر
مینوشیوں کا ذوق مگر کم نہیں ہوا

سوگندِ حادثاتِ مسلسل مجھے ندیم
دل بے نیازِ کشمکشِ رم نہیں ہوا

وہ التہاب ارض و سما در کنار ہے
وہ التہابِ نفس کہ پیہم نہیں ہوا

اے چرخ تیرے واسطے سب مہر بن گئے
پھولوں کے واسطے کوئی شبنم نہیں ہوا

وہ بد نصیب روحِ گل و لالہ ہیں ظفرؔ
جن کا شعار، نالہ و ماتم نہیں ہوا

نمود زندگی کی ابتدا سے
ہوا دشت کو تشنگی انتہا سے
تبسم جبیں پر مسلسل کسی کے
ہر یک ذرہ کو تابانی عطا کی

(۱۳)

دلِ مطلعِ وحدت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
اس جام میں حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

تابانیِ گل، نشّۂ مُل، نالۂ بلبل،
فیضانِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

جلوؤں کی طرف دیکھنے والے مجھے دیکھیں
جلوہ مری وحشت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

میخانۂ اسرار میں، رعنائیِ افکار
اک تیری عنایت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

آخر یہ کھلا منزلِ کونین کی ترتیب
مومن کی فراست کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

اس طرح سے دل حرف و حکایات میں گم ہے
دل حرف و حکایت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

ذرّوں کی طرف مرحمتِ خاورِ زرتاب
پیرایۂ حجت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

پُرپیچ ہیں الفاظ رضا اور قضا کے
دیدار کی لذت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

توڑا جو مرے شوق نے امکانِ عبارت
پایا کہ اشارت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

اس طرح ظفر حاضرِ دربارِ کرم ہے
دامن میں ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

(۴)

حقیقت ان کی حکمت کی فریبِ آرزو تک ہے
وہ جن کی جستجو یارب، مقامِ رنگ و بو تک ہے

بہاروں کی تلاطم خیزیاں موقوف ہیں اس پر
چمن با وصفِ یکتائی مجازاتِ نمو تک ہے

وہ چاہیں بھی تو پا سکتے نہیں ہیں روحِ میخانہ
وہ جن کی مے پرستی گردشِ جام و سبو تک ہے

یہ لکھا ہے کسی کافر نے تائیدِ محبت میں
ثریا کی بلندی ابتذالِ آرزو تک ہے

قباچاکی گلوں کی باعثِ خجلت ہے آدم کو
شکایت چاک داما ئی کی احساسِ رفو تک ہے

تجسّس اور تحیّر پر بنا ہے خاکِ آدم کی
ہماری زندگانی کاروبار ھا و ہو تک ہے

جمالِ دوست کی تشریح کوئی کیسی فرمائے
یہ ساری گفتگو اے دوست اذنِ گفتگو تک ہے

ابھی ان کا شعورِ عقل و مستی غیر محکم ہے
تگاپو ہمنشینوں کی حدودِ ما و تو تک ہے

مری فطرت میں ساقی نے چھپا رکھا ہے طوفاں کو
تلاطم کی خموشی قید و بند آبجو تک ہے

مرے ساقی کے اعجازِ کرم پر حرف آتا ہے
اگر تعبیر ہستی کی، مقامِ کاخ و کو تک ہے

(۵)

یہ کس کی تجلّی ہے مرے ساتھ قدم زن
ہر جادۂ پُر پیچ ہے غیرت دہِ ایمن

ہے باعثِ تقدیسِ گل و لالہ و گلشن
وہ جذب کہ اب تک نہیں شرمندۂ دامن

ارباب دل و دین کا سامان عجب ہے
اک دیدۂ پُر آب ہے اک سینۂ روشن

دستور ہے جب روحِ خزاں دشمنِ گل ہو
اطرافِ گلستاں پہ لگا دیتے ہیں قدغن

ایّام بلا خاص عنایات کے دن ہیں
ظالم ہے محبت میں جو کہتا ہے اُھا تنگ

ہر گام مری سمت کھینچی آتی ہے منزل
یہ جادۂ غربت، ہمہ احسن، ہمہ احسن

(۶)

اٹھا کے پیرِ مغاں نے قیودِ پیمانہ
بتا دیا مری فطرت کو روحِ میخانہ

اگر نصیب ہو چشمِ یقیں تمام یقیں
بغیر چشمِ یقیں ہے تمام افسانہ

تمام رات پشیماں رہی تجلّی سے
نثارِ شمع ہوا اس طرح سے پروانہ

"یہ ایک فرقِ مراتب ہے جذب و مستی کا"
جنوں شعار ہے کوئی نہ کوئی فرزانہ

مجھے دوگونہ تعلق ہے خرقہ پوشی سے
عطا ہوئی ہے مجھے فطرتِ ملوکانہ

اسی سے عرصۂ بود و نبود باقی ہے
عجیب چیز ہے ہمدم نشاطِ رندانہ

مرے جلو میں ہر اک چیز گرم روہے ظفر
سبیلِ شوق میں کوئی نہیں ہے بیگانہ

---

(۷)

ہر سانحہ اپنی زندگی کا
قرآن ہے منزلِ خودی کا

طوفان میں ڈال کر صدف کو
دیتے ہیں ثبوت زندگی کا

ہر زخم سے شرم آ رہی ہے
احسان ہے مجھ پہ دلدہی کا

سمجھا نہیں بیخودی کو یارب
کتنا ہے فریب آگہی کا

ہر شخص نے تجھ کو پا لیا ہے
مفہوم یہی تھا خامشی کا

(۸)

کامیابِ مراد کب نہ ہوا　　دل کہ آلودۂ طلب نہ ہوا

تب کھلا آپ ہی شریکِ سفر　　میرے ہمراہ کوئی جب نہ ہوا

ایک سجدہ ہے وہ بھی ننگِ جبیں　　حسن کا ہم سے کچھ ادب نہ ہوا

وہی قطرہ ہے گرمِ تاک کہ جو　　"رگِ تر، و بادۂ عنب نہ ہوا"

اے چشمِ میگوں تری قسم کہ کبھی　　کوئی پیمانہ لب بہ لب نہ ہوا

اس کو واماندۂ طلب نہ کہو　　دل کہ بیگانۂ طلب نہ ہوا

ہاں ظفرؔ ہے تری نظر کی قسم
شغلِ پیمانۂ طرب نہ ہوا

(۹)

تا وسعتِ امکانِ نظر، کیفِ نظر ہے
یہ میری نظر کیا ہے ترا پردۂ در ہے

دنیا طرفِ میکدہ کیوں گرمِ سفر ہے
شاید تری نظروں کا اشارہ بھی ادھر ہے

میں تیری تمنّا سے گلہ مند نہیں ہوں
مجھ پر تو یہی لطفِ مسلسل ہے اگر ہے

کونین اِدھر لرزہ بر اندام ہیں کب سے
کب سے کوئی دیوانہ اُدھر خاک بسر ہے

نظروں پہ نہیں، دل پہ تعیّن ہے یقیں کا
دل ہی کی شہادت ہے کہ کعبہ ترا در ہے

اس طرح سے طوفان تو آیا نہیں کرتے
شاید پسِ طوفان کوئی تازہ گہر ہے

گو مجھکو تعلق کا یقیں تجھ سے نہیں ہے
اے شوخِ ستمکار تعلق تو مگر ہے

واماندہ مسافر کے قدم کانپ رہے ہیں
منزل نظر آئی ہے کہ اب ختمِ سفر ہے

ہاں اے شہِ خوباں کبھی دل بھی تھا جگر بھی
لیکن شہِ خوباں نہ وہ دل ہے نہ جگر ہے

تا خاکِ صفاہاں نظر آتا ہے تہیج
اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ آہنگِ ظفر ہے

ایسا بھی اک مقام محبت میں آگیا
میں رہ سکا خموش نہ ان سے رہا گیا

اس پر ہزار بار سلامت روی نثار
جو لڑکھڑا کے عالمِ ہستی پہ چھا گیا

دل کچھ نہیں شکستۂ یک جنبشِ نظر
لیکن تری نظر کے مقابل تو آگیا

اللہ رے مقامِ دلِ کم سواد کا
ٹوٹا تو ایک نغمۂ امکاں سنا گیا

میں تجھ سے دور دور ہوں تو مجھ سے دور دور
لیکن مجھے بہار کا موسم رُلا گیا

اک ذرۂ حقیر کہ ہوتا رہا نثار
لیکن اک آفتاب کہ دامن بچا گیا

کتنا کہا ظفرؔ نے، خدارا ادھر نہ دیکھ
آخر تری نگاہ پہ الزام آ گیا

(۱۱)

کسے نسبت ہے چشمِ معتبر سے
عذر اے دل جہانِ کم نظر سے

چمن بھی اب قفس سے کم نہیں ہے
یہ محفل تھی کسی آشفتہ سر سے

متاعِ کاروانِ زندگی ہیں
ڈھلک جائیں نہ گوہر چشمِ تر سے

منور ہے حریمِ زندگانی
گدازِ شام سے آہِ سحر سے

سلیقے رہ نوردانِ چمن کو
ملے کیا کیا دلِ شوریدہ سر سے

ادب سے نام لیتا ہے کسی کا
بہت حیرت ہوئی مل کر ظفرؔ سے

(۱۲)

اب دل کو اہتمامِ مداوا نہیں رہا
یعنی جو اضطراب کبھی تھا، نہیں رہا

آیا ہوں گردشِ مہ و پرویں لئے ہوئے
اب کافری میں شوق اکیلا نہیں رہا

اے منحرف شریعتِ اندازِ حسن سے
اب سجدہ صرف ریزشِ مینا نہیں رہا

پیغمبرِ سکوں کوئی ہو، مجھے غرض
روتا ہوں اب کوئی ستم آرا نہیں رہا

ارضِ حرم سے دور ترے آستاں سے دور
تھا ایک بے نیازِ تمنّا، نہیں رہا

اب لاکھ ابر جھوم کے آئیں سبو بکف
اے فصلِ غنچگی کوئی تیرا نہیں رہا

تھا یاد اک ترانۂ عرفانِ زندگی
اب وہ بھی اے زوالِ تمنا نہیں رہا

اے کاروانِ موسمِ گل خیمہ زن نہ ہو
ہے دل پہ اختیار یہ اتنا نہیں رہا

غنچوں کو کیا ہوا کہ جگر چاک اب بھی ہیں
حالانکہ اب تو کوئی تقاضا نہیں رہا

گم ہو گیا امینِ نگاہِ جہاں نما
دل کچھ نہ تھا پہ اب کوئی ایسا نہیں رہا

(۱۴)

زندگی مہبطِ الہام نظر آتی ہے
تیرے نادیدہ اشارات کو سمجھاتی ہے

کوئی کہدے کہ وہ اسطرح نہ دیکھیں مجھکو
زندگی تابعِ ایام ہوئی جاتی ہے

ہائے وہ شوقِ ملاقات کا عالم اے دوست
جب مری روح ترے نام کو دہراتی ہے

آتے آتے وہ کہیں بر سرِ بام آتے ہیں
آرزو تابہ سحر سجدے کئے جاتی ہے

عمر بھر تیرے نظاروں ہی سے فرصت نہ ملی
کس کو تسلیم کہ دنیا بھی نظر آتی ہے

اے مری خود نگری، خود شکنی، کچھ بھی نہیں
ہمنشیں لذتِ مے دیر میں راس آتی ہے

سجدۂ شوق ضروری ہے دو عالم کیلئے
زندگی مشکلِ آفاق سے گھبراتی ہے

فصلِ گل یعنی سراپردۂ اعجازِ جنوں
سب یہ کہتے ہیں کہ آتی ہے، کہاں آتی ہے

آؤ اے ہم نفسو! شغلِ مے و جام کریں
آرزو بادۂ گلگوں سے نکھر آتی ہے

(۱۴)

طوفاں کو زیب دوش بنائے ہوئے ہیں ہم
سینے میں بجلیوں کو چھپائے ہوئے ہیں ہم

اک شمع جانگداز جلائے ہوئے ہیں ہم
اے حسن تیری بات بنائے ہوئے ہیں ہم

لو تیرے آستاں سے لگائے ہوئے ہیں ہم
دونوں جہاں سے آنکھ چرائے ہوئے ہیں ہم

ہم پر ہوا نہیں اثر انقلاب نو
کچھ بات ہے کہ سر کو جھکائے ہوئے ہیں ہم

اب اُن کے اندمال کی حاجت نہیں رہی
جو زخم تیری آنکھ سے کھائے ہوئے ہیں ہم

اے برقِ مضطرب، ترا چھپنا، محال ہے
ہاں ہاں مقامِ طور پہ آئے ہوئے ہیں ہم

ہیں کتنے بے نیاز، بہارِ دوام سے
یعنی تری نظر کے ستائے ہوئے ہیں ہم

اب مٹ گیا ہے فاصلۂ شاہد و شہود
کون و مکان و عرش پہ چھائے ہوئے ہیں ہم

تسکین و اضطراب، تلاطم، امید و یاس
ایسے فریب اور بھی کھائے ہوئے ہیں ہم

تیرا فریبِ ناز نہ کیوں ہم سے چھپ سکے
دامن میں حشر کو بھی چھپائے ہوئے ہیں ہم

صیاد کا خیال ہے ورنہ ظفرؔ یہ دام
ایسے ہزار دام اڑائے ہوئے ہیں ہم

(۱۵)

مانا کہ عجیب سلسلۂ کون و مکاں ہے
لیکن ترے دیوانے کو آرام کہاں ہے

اے قلقلِ مینا سے نظر پھیرنے والو
یہ قلقلِ مینا ہی نہیں بانگِ اذاں ہے

پروانہ و بلبل کی حکایت سے گذر جا
اے بے خبرِ عشق یہی عینِ فغاں ہے

راس آ نہیں سکتا اسے اندازِ من و تو
خود جلوۂ بیتابِ جنوں جس کی زباں ہے

ساقی کی نظر میں بھی ہیں انداز طلب کے
شاید پسِ مینا مری فطرت نگراں ہے

منزل جسے اربابِ نظر کہہ کے رکے ہیں
اے قافلۂ شوق وہ منزل کا نشاں ہے

ہر ایک سبو، ظرفِ سبوخانہ کا حامل
ہر رند یہاں قبلۂ اربابِ مغاں ہے

آسان ہے توبہ شکنی ٹھیک ہے لیکن
ساقی نہ دعا دے تو یہ آسان کہاں ہے

ایسا تو نہیں تم نے پکارا ہو ظفرؔ کو
یہ کیا کہ اسے خود پہ تمہارا ہی گماں ہے

(۱۶)

قدم طلب کا رہا وقفِ جادہ پیمائی
اسی کا نام ہے ذوقِ طلب کی رسوائی

شہادتِ گل و بلبل بہت ضروری ہے
کوئی ہزار پکارا کرے بہار آئی

وہ خود فریب مقامِ دعا کو کیا جانے
جسے نصیب نہیں آرزو کی پہنائی

خبر کرو دلِ بلبل کے زخمِ پنہاں کو
بہار چھوڑ چکی سعیِ چارہ فرمائی

شرابِ ناب سے روشن ہے ساغرِ گلفام
کسی کا عجز کسی کیلئے ہے یکتائی

بہار سوئے گلستاں ہوئی ہے گرم خرام
لئے ہوئے دل و دیدہ میں حسنِ صحرائی

ظفرؔ بہار بھی اس کے لئے بہار نہیں
نصیب جس کو نہیں ہو سکی خود افزائی

---

(۱۷)

عمر بھر منزلِ سفر نہ ملی
ہمسفر اُن کی رہگذر نہ ملی

تیرے جلووں میں گم ہوئے ایسے
ہم کو اپنی کوئی خبر نہ ملی

وہ کسی کی نگاہِ روح نواز
ڈھونڈتے ہی رہے مگر نہ ملی

برق سے تجھکو اے اسیرِ چمن
لذتِ سوزشِ جگر نہ ملی

کیا ظفرؔ ان کو بھول جاؤ گے
تم کو آسودگی اگر نہ ملی

ڈھونڈا ہے ہر شوق نے اک جادۂ دشوار
ہے کوئی تجلی تری آمادۂ اظہار

خم ایک ہی کعبہ کی طرف سب کی جبیں ہے
تعبیر کی تفریق ہے آزاد و گرفتار

ہے سینۂ شمشیر میں یہ راز ازل سے
زندہ ہے بس اک نعرۂ تکبیر سے پیکار

خود میں نے ہر اک ذرہ کو مسجود بنایا
خود میرے تجسس سے ہر اک شے ہے پُر اسرار

آتی ہے مجھے امینِ حکمت سے یہ آواز
ہے تیرا جنوں گرمیٔ ہنگامۂ بازار

تاب وتب پیہم کی پتنگے کو خبر کیا
خود شمع کے جلوؤں نے بنایا ہے یہ کردار

دیکھیں گے تلاطم کا جگر چیر کے کیا ہے
ساحل سے غرض ہے نہ سفینہ سے سروکار

بلبل کا جگر پھول کی پتی سے کبھی خوں
دیکھا ہے کہ شاخیں کبھی ہو جاتی ہیں تلوار

(۱۹)

جنوں آمادۂ پیکار و گوہر بار ہو جائے
گُلِ تر سے یہ کہہ دو مطلع الانوار ہو جائے

سبوئے مُل، بہارِ گل، ہمہ سرشار جز و کل
یقینی ہے شکستِ نخوت و پندار ہو جائے

دو عالم اس کی لغزش کے برابر آ نہیں سکتے
وہ میکش جو یکایک صاحبِ اسرار ہو جائے

جبیں زرتاب، آنکھیں مست، ساغر مست، ساقی مست
یہ ہونا کفر ہے لیکن کبھی اک بار ہو جائے

خزاں کیسی بہار آئے تو ایسی شان کی آئے
گلِ تر کی رگِ نمناک بھی تلوار ہو جائے

کوئی ایسا بھی ہے جو چشمِ ساقی تک پہنچ جائے
کوئی ایسا بھی ہے جو بے پئے سرشار ہو جائے

ظفرؔ آگے بڑھو وہ سامنے آثارِ منزل ہیں
"بالآخر وقت آپہنچا، جنوں بیدار ہو جائے"

---

(۲۰)

چمن میں جب فروغِ جبرِ استبداد ہوتا ہے
زبانِ گل سے پیدا شکوۂ صیاد ہوتا ہے

مرا برباد ہونا ہے بہارِ گل کی بربادی
مری وارفتگی سے صحنِ گل آباد ہوتا ہے

چمن ہو یا نشیمن ہو، گلستاں ہو کہ زنداں ہو
اسیرِ حسن بھی آخر کہیں آزاد ہوتا ہے

نہ پوچھو کس قدر ژولیدگی ہوتی ہے تاروں میں
کوئی جب آخرِ شب مائلِ فریاد ہوتا ہے

وہ اک سوزِ دروں جس کو چھپانا چاہتا ہوں میں
وہی کمبخت آخر بانیٔ بیداد ہوتا ہے

جو اشکِ گرم پلکوں پر تڑپتا ہے سرِ محفل
ظفرؔ وہ زندگی کی مختصر روداد ہوتا ہے

(۲۱)

میری جبیں کی خیر، ترے آستاں کی خیر
یعنی مقامِ سلسلۂ این و آں کی خیر

مدت گذر گئی ہے تمنا کئے ہوئے
اے جانِ آرزو نگہِ بے اماں کی خیر

دو چار تنکے میں نے بہم کر لئے ندیم
بس اور چند روز ہے برقِ تپاں کی خیر

میں نے سمجھ لیا ہے تجھے دل کی زندگی
اب دل کی خیر ہے نہ دلِ دو جہاں کی خیر

میری نظر ہزار اسیرِ جہاں سہی
جلووں کی خیر اور دلِ آتش بجاں کی خیر

لغزیدہ چند گام چلا ہے ظفرؔ کے ساتھ
اے دوستو! مبارزۂ آسماں کی خیر

(۲۲)

پاتا ہوں سجدہ ریز جو شمس و قمر کو میں
سمجھا ہوں آسمان تری رہگذر کو میں

میری جبینِ شوق ، بڑا کام کر گئی
کعبہ بنا رہا ہوں ترے سنگِ در کو میں

جلوے شریکِ دیدۂ پُر آب ہو گئے
پہنچا ہوں کامیابیٔ لعل و گہر کو میں

پھر آستیں کو شوق مری چشمِ نم کا ہے
کم کر رہا ہوں قیمتِ لعل و گہر کو میں

تکلیف دو ذرا نگہِ جلوہ یار کو
آواز دے رہا ہوں طلوعِ سحر کو میں

کچھ دن جو میرے ساتھ رہی گردشِ جہاں
اس پر کھلا نہ تھا کہ چلا ہوں کدھر کو میں

(۲۳)

جلوہ تمام دشت و در، جلوہ تمام بحر و بر
جلوہ کسی کے شوق میں جلوہ کسی کے طور پر

کوئی ابھی اٹھا نہیں، منزلِ ہست و بود سے
کوئی ابھی اٹھا نہیں، راہنما و راہبر

لالہ و گل کی عافیت، برق سے ملتجی نہیں
برق کہاں جھکائے سر، لالہ و گل نہوں اگر

ایک نگاہِ مرحمت، ایک نگاہِ جستجو
ایک سوالِ بیکراں، ایک جواب مختصر

آپ کے ہاتھ میں تو ہے رشتۂ کارِ زندگی
آپ ادھر نہ دیکھیے، آپؐ دیکھیے اِدھر

کثرتِ شوق الاماں، زیست نہیں تلاش ہے
کثرتِ جلوہ الاماں، تنگ ہے دامنِ نظر

آپ کے ساتھ ساتھ ہیں، آپ کی جلوہ باریاں
اور مرے جلو میں ہے ایک نگاہِ خستہ تر

خاص اگر ہو اک نگہ، عام اگر ہو اک جہاں
کتنا دراز و مختصر، اہلِ تلاش کا سفر

کشمکشِ حیات سے تنگ نہیں مرا جنوں
آپ گواہ پر گواہ، کشمکشِ حیات پر

خیر مرے لئے نہ ہوں، عالمِ کُن کی وسعتیں
بس ہے مرے لئے ظفر وسعتِ جلوہ و منظر

(۴۲)

مایوسیوں نے حرفِ تمنّا مٹا دیا
ہم کو دیا بھی آپ کے غم نے تو کیا دیا

کیا چیز ہے ندیم فروغِ جمالِ مے
دل کو حریفِ جلوۂ جاناں بنا دیا

دشوار تھا مبارزۂ جبر و اختیار
لیکن ترا کرم کہ دلِ مبتلا دیا

تھے جتنے یادِ عہدِ محبت کے حادثات
ان سب کو اس تغافلِ بیجا بھلا دیا

مانا ظفر غزل میں نبرد آزما نہیں
ظالم کی سادگی نے نرالا مزا دیا

(۲۵)

آتی ہے اب نسیمِ سحر جھوم کر کہاں
اب ہم کو اعتبارِ نسیمِ سحر کہاں

نادم ہوں واقعی، کرم بے حساب ہے
خوش آمدید! آپ کہاں، میرا گھر کہاں

اب تک معاملاتِ نظر استوار ہیں
ہوتے ہیں جا کے دیکھئے زیر و زبر کہاں

بجلی پناہ لینے پہ مجبور ہو گئی
یہ لوگ دیکھتے ہیں مرے بال و پر کہاں

گو شورشیں بہت ہیں قیامت کے نام میں
لیکن وہ پُر تپاک تمہاری نظر کہاں

اے وقت اپنی کوششِ رفتار پر نہ جا
کاشانۂ فقیر میں، تیرا گذر کہاں

شمس و قمر کے بعد ملے تھے جلیلؔ بھی
آخر پہنچ گئے ہو، کہاں سے ظفرؔ کہاں [۱]

---

[۱] تلمیح بہ شعر برادرم عبدالجلیل جلیلؔ راغبی ؎
گم ہیں سوادِ راہ میں شمس و قمر جلیلؔ
لیجائے گا مجھے میرا ذوقِ سفر کہاں

(۲۶)

یہ اہلِ ہوش، آئینِ جنوں کو کیا سمجھتے ہیں
مری حیرت کو دیوانے رخِ لیلیٰ سمجھتے ہیں

نگاہِ جستجو اٹھتی رہی، جھکتی رہی، گویا
نقابِ رخ الٹ دینے کو ہم پردا سمجھتے ہیں

وہی تاکِ چمن میں کاروبارِ لالہ و گل ہے
وہ جس کو بادہ کش، آرائشِ مینا سمجھتے ہیں

وہ جن کو عرصۂ آفاق ہے دہلیزِ میخانہ
وہ اکثر پرتوِ خورشید کو مینا سمجھتے ہیں

گلوں کا سامعہ درکار ہے بلبل کے شیون کو
بہت کم رند رازِ قلقلِ مینا سمجھتے ہیں

وہ جن کی مے پرستی چشمِ ساقی سے عبارت ہے
وہ میکش بابِ میخانہ ہمیشہ وا سمجھتے ہیں

وہ جس نے موجۂ دریا کی وسعت روک رکھی ہے
اسے کچھ لوگ اب تک ساحلِ دریا سمجھتے ہیں

بڑی مدت میں وحدت کیش ہو پائے ہیں دیوانے
کہ ہر ذرے کو عکسِ محمل لیلےٰ سمجھتے ہیں

متاعِ غم عطائے خاص ہے سجدوں سے کیا ہوگا
یہ دولت اس کو دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

ظفرؔ صحنِ چمن میں ان خردمندوں کا ماتم ہے
جو شاخوں کی لچک کو نشۂ صہبا سمجھتے ہیں

(۲۷)

نذرِ میر

رُت بدلے گی، پھول کھلیں گے، جام مجھے چھلکانے دو
جام مجھے چھلکانے دو، کونین کو وجد آ جانے دو

تم آؤ تو سب شرمائیں، جاؤ بھی شرمانے دو
یہ بھی اگر منظور نہیں ہے، بات ہی کیا ہے جانے دو

ذرہ ذرہ سینہ کھولے، تیری طرف کیوں لپکے ہے
ہم بے چاروں کی بھی سن لو ہم کو وہاں تک آنے دو

ایسا کال پڑا ہے یارو، اب انساں کو ترسوں ہوں
ایک اکیلا میں ہوں جگ میں سب کو ستم فرمانے دو

تم بن اپنی رین اندھیری دور تلک سناٹا ہے
ایک مرا یہ دل ہے پیاسا اور مرے پیمانے دو

بجلی چمکے، بادل گرجے، بوٹہ بوٹہ جھومے ہے
تجھ بن دیکھوں ان کی جانب جاؤ بھی بہکانے دو

مدعا کے دیوانے، حسنِ مدعا ہو جا
پیکرِ رضا بن کر، جلوۂ خدا ہو جا

چھوڑ قطرۂ شبنم، چھوڑ عارضِ غنچہ
حسن خود کرے سجدہ ایسی اک ادا ہو جا

بو اسیرِ حلقہ ہے رنگ رہنِ دامن ہے
جستجو مبارک ہو، موجۂ صبا ہو جا

نغمے لاکھ پیدا ہوں، نغمہ گر کے دم تک ہیں
جس پہ نغمہ نازاں ہو ایسی اک صدا ہو جا

رنگ و بو کی دنیا کیا، پھول کی قبا تک ہے

وہ افق کی وسعت ہے، تو ادھر صبا ہو جا

ذرہ سامعہ پائے، نجم ناطقہ پائے

تو جہاں کی وسعت میں ایسی اک صدا ہو جا

ہاں اگر ضروری ہے تیرا لب کشا ہوتا

چوم کر جبیں گل کی تو بھی لب کشا ہو جا

نیستی و ہستی میں دل کی دھڑکنیں بھر دے

"عین ابتدا ہو کر، عینِ انتہا ہو جا"

(۲۹)

نذرِ اصغر

جہاں جہاں مری ہستی ہے عکسِ نا مشہود
وہیں وہیں متبسم ہے کائناتِ وجود

اڑا ہے ییکے مجھے صرف میرا ذوقِ سجود
کوئی ہزار پکارا کرے انا المعبود

مرے حضور میں خم ہیں تعینّاتِ خرد
کسے ملی ہے تری نرگسِ خمار آلود

تری نگاہ کی پاکیزگی نے کیا نہ کیا
بساطِ کون و مکاں دامنِ شراب آلود

وہ لغزشیں جنھیں نسبت تمھارے نام سے ہے
انھیں کے نام سے زندہ ہے کاروبارِ وجود

مقامِ ناز مقامِ نیاز ہے یعنی
"شہود غیب ہوا غیب ہو گیا ہے شہود"

یہ زندگی وہ تلاطم، یہ آرزو وہ کرم
ابھی تو اور مقامات بھی ہیں نامشہود

جنوں کے ہاتھ ہے اب آبروِ عبادت کی
بنا دئے ہیں خرد نے ہزارہا معبود

(۳۰)

نذرِ اصغرؔ

ابھی رہنے دو پردے میں، جمالِ روئے خنداں کو
ملی ہے فرصتِ یک دو نفس، صبحِ بہاراں کو

مرے ہمراہ رہنے دو، نگاہِ برق ساماں کو
ابھی سمجھی نہیں دنیا، مذاقِ سوزِ پنہاں کو

کوئی سمجھے تو کیا سمجھے تبسم ہائے پنہاں کو
رگِ آفاق بن جانے تو دو میری رگِ جاں کو

بہاریں پا شکستہ، میں اسیرِ بے پر و بالی
قفس میں کون لے آیا خداوندا گلستاں کو

مقامِ رنگ و بو کی عظمتیں کچھ کم نہیں یعنی
ہر اک ذرہ لئے ہوئے گود میں مہرِ درخشاں کو

ابھی تو خیر ہے اے کائناتِ رنگ و بو تیری
ابھی پردہ بنایا ہے مری بیتابیٔ جاں کو

ابھی تو مشتِ پر کا تذکرہ ہے عرصۂ گل میں
کوئی سمجھا نہیں شاید ابھی رازِ گلستاں کو

جبینِ گل، بہارِ مُل، یہاں پنہاں، وہاں پیدا
کوئی پردہ نہ راس آیا ترے حُسنِ نمایاں کو

خدا شاہد ہے دردِ آرزو میں تجھ سے نادم ہوں
ابھی دہرا رہا ہوں واقعاتِ کفر و ایماں کو

کرم کے ساتھ لامحدود تھیں لغزشیں ہم نے
بقدرِ ظرف کیا رکھتے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

بہاریں واسطہ کب تک، بہاریں منفعل کبتک
"کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو"

(۳۱)

نذرِ اصغر

ایک نگاہِ خاص تھی اور بڑے سرور میں
ایک مئے طہور تھی، ایک مئے طہور میں

حسن ہے بے حجاب سے، دل ہے اسیرِ درد ہے
آج مقابلہ کی ہے، عالمِ جذب و نور میں

پھر دلِ کفر پیشہ کو، حوصلۂ سوال ہے
کاش کوئی کمی نہ ہو چشمکِ برقِ طور میں

ایک حجابِ ماد تو، محتسبِ حیات تھا
آہ مجھے یہ کیا ہوا آکے ترے حضور میں

ذکر نہیں قصور کا، بات ہے اعتراف کی
حیف وہ نسبتیں جو تھیں میرے ہر اک قصور میں

پیچھے چھوڑ دیئے، جنوں والوں کو، اپنانے چلے

ٹھوکریں کھانے چلے، یعنی کہ بہکانے چلے

اللہ اللہ، دین و دل کا مرحلہ آساں نہیں

ایک پیمانہ اٹھا، اور لاکھ افسانے چلے

نظمیں

مراثی اور قطعات

ترانۂ دارالعلوم

یہ علم و ہنر کا گہوارا، تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے
ہر پھول یہاں اک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے

خود ساقیٔ کوثر نے رکھی، میخانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے دیوانوں کی روداد یہاں

جو وادیٔ فاراں سے اٹھی گونجی ہے وہی تکبیر یہاں
ہستی کے صنم خانوں کیلئے ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں

برسا ہے یہاں وہ ابر کرم، اٹھا تھا جو سوئے یثرب سے
اس وادی کا سارا دامن سیراب ہے جوئے یثرب سے

کہسار یہاں دب جاتے ہیں طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اس کاخ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

ہر بوند ہے جس کی امرت جل، یہ بادل ایسا بادل ہے
سو ساگر جس سے بھر جائیں یہ چھاگل ایسا چھاگل ہے

مہتاب یہاں کے ذرّوں کو ہر رات منانے آتا ہے
خورشید یہاں کے غنچوں کو، ہر صبح جگانے آتا ہے

یہ صحنِ چمن ہے برکھا رت، ہر موسم ہے برسات یہاں
گلبانگِ سحر بن جاتی ہے ساون کی اندھیری رات یہاں

اسلام کے اس مرکز سے ہوئی تقدیس عیاں آزادی کی
اس بامِ حرم سے گونجی ہے سو بار اذاں آزادی کی

اس وادیٔ گل کا ہر غنچہ، خورشیدِ جہاں کہلایا ہے
جو رند یہاں سے اٹھا ہے وہ پیرِ مغاں کہلایا ہے

جو شمعِ یقیں روشن ہے یہاں وہ شمعِ حرم کا پرتو ہے
اس بزمِ ولیؐ اللّٰھی میں تنویرِ نبوت کی ضو ہے

یہ مجلسِ مے وہ مجلس ہے خود فطرت جس کی قاسم ہے
اس بزم کا ساقی کیا کہیے جو صبحِ ازل سے قائم ہے

جس وقت کسی یعقوب کی لَے اس گلشن میں بڑھ جاتی ہے
ذرّوں کی ضیا خورشیدِ جہاں کو ایسے میں شرماتی ہے

عابد کے یقیں سے روشن ہے سادات کا سچا صاف عمل
آنکھوں نے کہاں دیکھا ہوگا اخلاص کا ایسا تاج محل

یہ ایک صنم خانہ ہے جہاں محمود بہت تیار ہوئے
اس خاک کے ذرّے ذرّے کس درجہ شرر بیدار ہوئے

ہے عزم حسین احمد سے بپا ہنگامۂ گیر و دار یہاں
شاخوں کی لچک بن جاتی ہے باطل کیلئے تلوار یہاں

رومی کی غزل، رازی کی نظر، غزالی کی تلقین یہاں
روشن ہے جمالِ آدم سے پیمانۂ فخر الدین یہاں

ہر بندہ ہے ابراہیم یہاں، ہر مہ کش ہے اعزاز یہاں
رہبرانِ ہدیٰ پر کھلتے ہیں تقدیس طلب کے راز یہاں

ہیں کتنے عزیز اس محفل کے انفاسِ حیات افروز ہمیں
اس سازِ معانی کے نغمے دیتے ہیں یقیں کا سوز ہمیں

اس بزمِ جنوں کے دیوانے ہر راہ سے پہنچے یزداں تک
ہیں عام ہمارے افسانے، دیوارِ چمن سے زنداں تک

سو بار سنوارا ہے ہم نے، اس ملک کے گیسوئے برہم کو
یہ اہلِ جنوں بتلائیں گے، کیا ہم نے دیا ہے عالم کو

جو صبحِ ازل میں گونجی تھی، فطرت کی وہی آواز ہیں ہم
پروردۂ خوشبو غنچے ہیں، گلشن کیلئے اعجاز ہیں ہم

اس برقِ تجلی نے سمجھا، پروانۂ شمعِ نور ہمیں
یہ وادیٔ ایمن دیتی ہے، تعلیمِ کلیمِ طور ہمیں

دریائے طلب ہو جاتا ہے ہر پیکش کا پایاب یہاں
ہم تشنہ لبوں نے سیکھے ہیں مینوشی کے آداب یہاں

بلبل کی دعا جب گلشن میں فطرت کی زباں ہو جاتی ہے
انوارِ حرم کی تابانی، ہر سمت عیاں ہو جاتی ہے

ہر موج یہاں اک دریا ہے اک ملت ہے ہر فرد یہاں
گونجا ہے ابد تک گونجے گا آوازۂ اہلِ درد یہاں

امداد و رشید و اشرف کا یہ قلزمِ عرفاں پھیلے گا
یہ شجرہ طیب پھیلا ہے تا وسعتِ امکاں پھیلے گا

خورشید یہ دین احمد کا، عالم کے افق پر چمکے گا
یہ نور ہمیشہ چمکا ہے، یہ نور برابر چمکے گا

یوں سینۂ گیتی پر روشن، اسلاف کا یہ کردار رہے
آنکھوں میں رہیں انوار حرم، سینہ میں دل بیدار رہے

نغمۂ شوق

استاذ محترم حضرت مولانا محمد عثمان صاحب کاشف الہاشمی زید مجدہ
کی شادی کے مبارک موقعہ پر

ہر ذرہ یوں ہے مست کہ رقصاں کہیں جسے
ہر موج یوں رواں کہ غزلخواں کہیں جسے

وہ موج رنگ و نور گلستاں کہیں جسے
وہ روئے تابناک کہ قرآں کہیں جسے

ساقی شراب ناب کو چھلکا، کہ آگیا
وہ وقت، وقت عشرت رنداں کہیں جسے

ابھرا ہے آفتاب سحر لے کے تابشیں
در پردہ کیف صبح درخشاں کہیں جسے

اس طرح اتصال سے ہیں خندہ ہائے گل
طوفاں بدوش، موجِ بہاراں کہیں جسے

موجِ نشاطِ بادہ سے خم ہوگیا ہے خُم
وہ کفر ہے کہ غیرتِ ایماں کہیں جسے

موجِ بہار تازہ خبر لے کے آئی ہے
یعنی نشاطِ قلب و نظر لے کے آئی ہے

یہ وقت، ایک جذبِ فراواں کا وقت ہے
یعنی شباب و شعر کے ساماں کا وقت ہے

اک پیکرِ جمال کے جلوؤں سے الاماں
چشمِ طلب پہ بارشِ عرفاں کا وقت ہے

کونین کیوں غریقِ مئے سرخوشی نہ ہوں
دنیائے آب و رنگ کے طوفاں کا وقت ہے

تیر یک صرفِ نغمۂ عشرت ہوئی تو کیا
آخر ظہورِ جلوۂ جاناں کا وقت ہے

پھر میرے ناطقہ میں مچلتی ہیں بجلیاں
پھر جشنِ ارتباطِ دل وجاں کا وقت ہے

لے کر اٹھی ہے روحِ وفا، بربطِ عمل
یہ وقت جشن وفکر فروزاں کا وقت ہے

حسنِ نگار، حسنِ معانی کے ساتھ ہے
اے دوستو! کشاکشِ خوباں کا وقت ہے

ڈرتا ہوں اک مزاج سے برہم نہ ہو کہیں
ورنہ وہ جوش ہے کہ ظفر کم نہ ہو کہیں

محبت ماورائے این و آں ہے — محبت حاصلِ کون و مکاں ہے

محبت عام ہے سارے جہاں پر — محبت کیلئے سارا جہاں ہے

محبت سے بشر مسجودِ کوکب — محبت کی زمیں بھی آسماں ہے

محبت دیدۂ ظاہر سے پنہاں — محبت چشمِ باطن پر عیاں ہے

محبت ترجمانِ رازِ ہستی — محبت چشمِ قدرت کی زباں ہے

محبت ابتدائے جذب و مستی — محبت انتہائے عارفاں ہے

محبت شعلہ بار و شعلہ پرور — محبت لذتِ دردِ نہاں ہے

محبت التزام و ضبطِ عالم — محبت ارتباطِ قلب و جاں ہے

محبت سے جبینِ چرخ زرتاب — محبت سجدہ گاہِ کہکشاں ہے

محبت ہے ہمارا ذوقِ سجدہ
محبت ان کا سنگِ آستاں ہے

محبت ابتہاجِ قلبِ مضطر
محبت انبساطِ جاوداں ہے

محبت التہابِ برقِ ایمن
کلیم طور کا عزمِ جواں ہے

محبت صدرِ جبریلِ مکرم
محبت رحمتِ حق کی زباں ہے

محبت مستیٔ جامِ خودی ہے
محبت لغزشِ منزل نشاں ہے

محبت روح کی مشاطگی ہے
محبت باعثِ آرامِ جاں ہے

محبت نغمہ ریزی، عطر بیزی
محبت کاروبارِ گلستاں ہے

محبت آبروئے خستہ گامی
امیرِ کارواں ہے کارواں ہے

ہوس کہلا رہی ہے شاعروں سے
"محبت ایک سعیٔ رائیگاں ہے"

۱۸

فخر الاسلام حضرت مولانا السید فخر الدین احمد صاحب نور اللہ مرقدہ

اے علم ترا قافلہ سالار کہاں ہے

اے جذب ترا محرمِ اسرار کہاں ہے

اے عشق ترا ہبطِ انوار کہاں ہے

اے حسن ترا روئے ضیا بار کہاں ہے

اے دیدۂ نمناک یہ گلشن کی اداسی

وہ غنچۂ زرتاب و ضیا بار کہاں ہے

اے عزمِ فلک گیر کہاں جا کے چھپا ہے

وہ ہمتِ عالی کا سزاوار کہاں ہے

اے عالمِ افسوس تڑپنے کی اجازت

وہ سر سے قدم تک دلِ بیدار کہاں ہے

کیوں ابر نہ برسے دلِ خونبار کی مانند

اے عرصۂ گل، ابر گہر بار کہاں ہے

بازارِ معانی کا یہ عالم کہ ہمہ خول

اس جنسِ گرامی کا خریدار کہاں ہے

کلیوں کی زباں بند ہے پھولوں کی قبا چاک

بلبل ہمہ فریاد ہے گلشن ہمہ خاشاک

وہ جس کا ہنر عشق و محبت کا ہنر تھا

جو ظاہر و باطن کے لئے صبحِ اثر تھا

دل جس کا امانت کدۂ نطقِ گرامی

جو حسنِ شریعت کیلئے حسنِ نظر تھا

پرواز کی وسعت کہ جہاں زیرِ قدم تھا

اور کعبۂ مقصود، درِ خیرِ بشر تھا

اربابِ محبت کی امامت اسے زیبا

وہ پیکرِ تاباں ہمہ تن سوزِ جگر تھا

ہے خاک کی آغوش میں وہ مہر جہانتاب

جو شب کی سیاہی کیلئے نورِ سحر تھا

پروردۂ صد فصلِ بہاراں جسے کہیئے

اسلاف کے گلشن کا وہ ایسا گلِ تر تھا

تھا جس کی روانی پہ گماں سیلِ گراں کا

آساں جسے ہر مرحلۂ زیر و زبر تھا

وہ عشق کا ہمراز و ہم آواز نہیں ہے

محفل میں کوئی صاحبِ اعجاز نہیں ہے

ہیں مردِ مجاہد کے مگر ارض و سما اور

ہے اس کیلئے رسمِ بقا اور فنا اور

جو ذات کہ ہو زخمہ ورِ سازِ معانی

دیتی ہے اسے موت کمالاتِ نوا اور

وہ گوہرِ زرتاب کہ دریا جسے پا لے
موجوں کی کشاکش سے وہ پاتا ہے جلا اور

کِھلتا ہے اگر دامنِ صحرا میں یہ غنچہ
ہوتا ہے معطّر نفَسِ بادِ صبا اور

پروانے کی فطرت ہے طوافِ رخِ زیبا
ہوتا ہے رخِ شمع پہ خلوت میں فدا اور

بنتا ہے اگر نقشِ فنا، لوحِ رضا پر
آتے ہیں ابھر اس میں کمالاتِ بقا اور

وہ جس کے لئے عالمِ کُلّی پردۂ در ہو
اس مردِ خدا بیں کی ہے دنیا بخدا اور

گو خاک کی آغوش میں وہ ہیر مبیں ہے
مومن کیلئے موت مگر موت نہیں ہے

آہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہ

کیا ہوا اے افتخارِ عرصۂ ابر و بہار
کیوں لہو برسا رہا ہے دیدۂ خوں آبہ بار
کس طرف گم ہو گیا ہے آفتابِ زرنگار
آہ کس کو ڈھونڈتا ہے دیدۂ امیدوار

آہ وہ زینت دہِ صحنِ گلستاں ہے کہاں
شامِ فرقت کیا ہوا صبحِ درخشاں ہے کہاں

عزت کا شانۂ اربابِ عرفاں گم ہوا
آہ وہ دیباچۂ صبحِ بہاراں گم ہوا
آہ محفل سے چراغِ نور افشاں گم ہوا
آہ وہ سر تا قدم آیاتِ قرآں گم ہوا

آہ صحنِ گل کی جمعیت پریشاں ہو گئی
اے بہارِ گل ابھی سے چاک داماں ہو گئی

اے تلاشِ متصل سے آشنا اس نے کیا
جلوۂ خاموشِ دل کو رونما اس نے کیا
رہروؤں کو جادہ پیمائے رضا اس نے کیا
کارواں والوں سے پوچھو جو کیا اس نے کیا

اب کہاں ممکن کہ تاب جاوداں پیدا کرے
یعنی گلشن لالۂ عنبر فشاں پیدا کرے

آہ کس کی آنکھ بخشے گی ہمیں سوز و گداز
آہ روتا ہوں کہ ہم سے چھن گیا دانائے راز
ہم کہاں سے ڈھونڈ کر لائینگے صدقِ بے نیاز
صبحِ عشرت مختصر تھی شامِ ظلمت ہے دراز

آہ وہ قلب و نظر کی وارداتیں اب کہاں
اے سینہ تختی وہ حکمت کیش باتیں اب کہاں

کون پھونکے گا یہاں کردار کا پڑھکر فسوں
ڈھونڈتا ہوں صاحبِ دل، سوزشِ خیر القروں
اٹھ گئی صحنِ چمن سے، عزتِ اہلِ جنوں
موت! بتلا دے کہ آخر کس طرح ماتم کروں

وہ چراغِ علم ہے اور خاک کی آغوش ہے
آہ وہ طوفاں ہمیشہ کیلئے خاموش ہے

موت لیکن رایتِ قائم جھکا سکتی نہیں
نقشِ تابندہ کسی صورت مٹا سکتی نہیں
علم کی شمعِ درخشاں کو بجھا سکتی نہیں
تیرے عنوانِ عمل کو موت آ سکتی نہیں

موت نے تجھکو عطا کی ہے حیاتِ جاوداں
"تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں"

عیدیں

تلک عشرۃ کاملۃ

۱۔ مجاہد کی عید

زندگی کے واسطے درکار کیفِ جستجو
زندگی کے حوصلے ہیں زندگی کی آبرو

ہے جوابِ ماہِ نو، ہر جذبۂ عالم پناہ
عید کیا ہے احتسابِ کائناتِ و جاھدوا

۲۔ روزہ دار کی عید

زندگی کے حوصلے ہیں اور تائیدِ رضا
نقشِ فانی میں ابھرتے ہیں کمالاتِ بقا

اے ہلالِ عید رک کر اس کا بھی نظارہ کر
چشمِ روزہ دار، یعنی مہبطِ نورِ خدا

۳۔ سلطان کی عید

زندگی گرمِ سفر ہے عزمِ یکتائی لئے
عزمِ یکتائی فروغِ فالِ خود افزائی لئے
باادب ہے ہر ستارہ شوکتِ جبروت سے
چاند آیا ہے نئی شانِ صف آرائی لئے

۴۔ یتیم کی عید

عید یعنی یہ مسرت کا سماں میرے لئے
لیکے آیا ہے فغاں، ضبطِ فغاں میرے لئے
دیکھ مجھکو آگیا ہے راس ہر زخمِ کہن
اے ہلالِ عید! کوئی ارمغاں میرے لئے

۵۔ بیوہ کی عید

سخت مشکل ہے خدایا کاروبارِ ضبطِ غم
اک طرف ہنگامہ عشرت اک طرف فرطِ الم
اے ہلالِ عید کس کے واسطے لایا ہے تو
عید یعنی گردشِ ایام کا تازہ ستم

۶ - مزدور کی عید

گو جھکی جاتی ہے بارِ زندگانی سے کمر
گو شبِ تاریکِ ہستی میں نہیں نورِ سحر
اے ہلالِ عید! تیری نذر یہ نظارہ ہے
تیری جانب اٹھ رہی ہے ایک غربت کی نظر

۷ - محصل کی عید

معتکف ہیں معبدِ زر میں دل و دینِ حیات
یہ امید و ناامیدی یہ ثبات و ناثبات
اٹھ رہی ہے تیری جانب اک محصل کی نظر
اے ہلالِ عید! اے پیغامِ تحصیلِ زکوٰۃ

۸ - لیڈر کی عید

مدتوں میں جا کے بر آتی ہے دیرینہ امید
قوم کا گوشِ سماعت چاہتا ہے اک نوید
مل گیا قدرت کی جانب سے جہانِ رستخیز
کل مری تقریر کا عنوان ہے "تحریکِ عید"

۹ - غلام کی عید

دیدۂ و دل بے تجلّی، زندگانی بے امام
زندگی کے حوصلے ہیں زندگانی پر حرام
اے ہلالِ نو! ترے پیغام کے قابل نہیں
بارِ دوشِ ملّتِ بیضا، غلام بن غلام

۱۰ - میری عیدؔ

زندگی کو چاہیئے جذب و کمالِ سرمدی
اس جہاں میں زندگی ہے آرزو کی محکمی
اے وہ جس نے مجھکو دکھلایا جمالِ مَن سَعیٰ
ہو ہلالِ عید کی مانند میری زندگی

قطعات

(۱)

سحر کس کے لئے چاکِ جنوں ہے
شفق کس کے لئے غنابِ گوں ہے
ستارے کس طرف محوِ نظر ہیں
یہ شاید، منزلِ لایحزنوں ہے

(۲)

ہر اک شے کو تلاش و جستجو ہے
مآلِ زندگانی آرزو ہے
تڑپ اٹھنا، ٹھہرنا پھر تڑپنا
یہی شاید کمالِ رنگ و بو ہے

(۳)

خرد کو احتیاجِ بحر دبر ہے
کہ وہ بے سوز و بے کیف و اثر ہے
وہ کیا بخشے کسی کو جاودانی
نظر خود بھی گرفتارِ نظر ہے

(۴)

ہر غنچۂ فطرت پہ صدا دیتا ہوں
ہر پھول کو اعجازِ نوا دیتا ہوں
میخانہ کی عظمت کی قسم کھاتا ہوں
ہر شیشۂ زریں کو جلا دیتا ہوں

(۵)

اربابِ زیاں کار سنبھل جائینگے
طوفانِ تعین سے نکل جائینگے
یہ دیدۂ خونبار اگر زندہ ہے
حالات کسی روز بدل جائینگے

(۶)

کیا یہ ترے مستوں کا اثر ہے ساقی
شب آئینہ بردارِ سحر ہے ساقی
کونین ہر اک بار مچل جاتے ہیں
معلوم نہیں کس کی نظر ہے ساقی

مکتبۂ رحمت، دیوبند، یو، پی

(محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند) (محمد کفیل مشین مین)